باب ۱۴

مکی دَور پر ایک مجموعی نظر

اب ہمیں پیچھے پلٹ کر مکی دَور کے آغاز سے ہجرت تک کی تاریخ پر ایک مجموعی نظر ڈال کر یہ دیکھنا چاہیے کہ اسلامی تحریک ابتدا میں کیا سرمایہ لے کر اُٹھی تھی، ۱۳ سال کی مدت میں اس سرمایہ کے اندر کس کس نوعیت کے اضافے ہوئے، اور جب یہ مدنی دَور میں داخل ہوئی تو اس کے پاس کیا سرمایہ تھا جس سے کام لے کر اُسے مکی دَور کے حالات سے بالکل ہی مختلف، دوسری قسم کے حالات میں اپنی منزلِ مقصود کی طرف پیش قدمی کرنی تھی۔

اس تحریک کا ابتدائی، یا صحیح تر الفاظ میں بنیادی، سرمایہ صرف محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات، آپ کی شخصیت، اور آپ کی نبوت سے پہلے کی چہل سالہ زندگی تھی۔

حضورؐ کی عالی نسبی ذاتی حیثیت سے آپ عرب کے ایک شریف ترین خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کے حَسَب نَسَب کو تمام اہل عرب جانتے تھے، اور عرب کے بکثرت قبائل، جن کو اپنے نسب پر فخر تھا، اِس بات سے واقف تھے کہ پدری اور مادری سلسلوں میں کہیں نہ کہیں جا کر اُن کا نسب آپ کے نسب سے مل جاتا ہے۔ اس لیے آپ کی حیثیت یہ نہ تھی کہ کوئی مجہول النسب، غیر معروف، گمنام، یا کم اصل آدمی یکایک لوگوں کے سامنے ایک بہت بڑے دعوے کے ساتھ آکھڑا ہوا ہو جسے دیکھتے ہی کہنے والے کہہ دیں کہ اِس حیثیت کے آدمی پر تو یہ دعویٰ کسی طرح نہیں سجتا۔ پورے عرب میں کوئی شخص آپ کی شرافتِ نسبی پر شمّہ برابر بھی حرف گیری نہ کرسکتا تھا۔ خود شہر مکہ میں جتنے گھرانے اپنی عزت کے غرور میں ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے، اُن سب سے آپ کی اور آپ کے خاندان کی رشتہ داریاں تھیں۔ اُن میں سے بھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ اپنے حسب نسب اور معاشرتی مرتبے میں اس سے کسی طرح کم تر ہیں۔ قریش، جس کے ایک فرد آپ تھے، عرب میں سرداری کا مقام رکھتا تھا۔

اُس کا اولادِ اسمٰعیل سے ہونا ہر شک و شبہ سے بالا تھا۔ ملک کے اندر اور ملک سے باہر دُور دُور تک اس کے تجارتی روابط پھیلے ہوئے تھے۔ خانہ کعبہ کی تولیت اور حج کی کشش کے باعث عرب کے دُور دراز گوشوں تک کے لوگوں کو بہر حال اُس سے سابقہ پیش آتا تھا۔ اِن وجوہ سے اِس قبیلے کو عرب میں وہ بلند مرتبہ حاصل تھا جو کسی دوسرے قبیلے کو حاصل نہ تھا۔ پس مکّے جیسے مرکزی مقام پر، قریش جیسے ایک قبیلے میں پیدا ہونا، عرب کے ماحول میں اِس تحریک کے رہنما کے لیے مثالی موقع و محل تھا۔

آپؐ کا بنی اسماعیل میں سے ہونا

اسماعیلی خاندان کی بزرگی و شرافت اور عزت و منزلت کے ساتھ یہ بات بھی خاص اہمیت رکھتی تھی کہ ڈھائی ہزار سال کی پوری تاریخ میں حضرت اسمٰعیل کے بعد اِس خاندان کے کسی فرد نے کبھی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ اِسی بات کی نشاندہی بنی عامر بن صَعْصَعَہ کے ایک جہاندیدہ شیخ نے اُس وقت کی تھی جب اُس کے قبیلے کے لوگوں نے حج سے واپس آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی ملاقات اور گفتگو کا ذکر اُس سے کیا تھا۔ انہوں نے جب اس کو بتایا کہ قریش کے ایک صاحب ہمیں ملے تھے جنہوں نے نبی کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا اور ہم سے یہ چاہا کہ ہم انہیں اپنے ساتھ اپنے علاقے میں لے چلیں اور اللہ کا پیغام پہنچانے میں ان کی مدد کریں، مگر ہم نے ان کی بات قبول نہ کی، تو اُس مردِ کہن سال نے اپنا سر پیٹ لیا اور کہا " اُس وقت تمہاری عقل کہاں چَرنے چلی گئی تھی؟ خدا کی قسم آج تک کسی اسماعیلی نے ایسی بات جھوٹ گھڑ کر کبھی نہیں کہی ہے"۔ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اولادِ اسماعیلؑ میں سے ہونے کا ایک اور فائدہ تھا۔ تاریخ یہ شہادت دے رہی تھی کہ آپ کا دعوائے نبوت برحق ہے، کیونکہ اِس خاندان کا کوئی شخص کبھی نبوت کا جھوٹا دعوے لے کر نہیں اُٹھا تھا۔

آپؐ کی شخصیت

جہاں تک حضوؐر کی شخصیت کا تعلق تھا، آپ کی شکل و صورت اور وضع و ہیئت اور نشست و برخاست اور رفتار و گفتار اور شائستہ اطوار کو دیکھ کر بچپن ہی سے عرب کے قیافہ شناس یہ کہہ رہے تھے کہ یہ کوئی غیر معمولی ہستی ہے جو عبدالمطلب کے خاندان میں پیدا ہوئی ہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ، آپ کے جدِّ امجد، آپ کے چچا، آپ کی رضاعی والدہ، سب کے تاثرات تاریخ میں محفوظ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سنی ہی میں جو لوگ آپ کو قریب سے دیکھ رہے تھے وہ آپ کے اندر ایک نمایاں عظمت محسوس کر رہے تھے۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ ایک بالکل اجنبی آدمی بیک نظر آپ کو دیکھ کر پکار اُٹھتا کہ خدا

کی قسم یہ کسی جھوٹے انسان کا چہرہ نہیں ہے۔ جب آپؐ جوانی کی عمر کو پہنچے تو آپؐ کی شان ہی کچھ ایسی تھی کہ آپ کے اہلِ وطن اور اہلِ قبیلہ آپ کی شخصیت سے مرعوب ہوتے چلے گئے۔ لوگ خود بخود آپ کا احترام کرتے تھے، کیونکہ وہ اپنے معاشرے کی عام سطح سے آپ کو بہت بلند پاتے تھے۔ آپ کی وجاہت، آپ کا وقار، آپ کی سنجیدگی، آپ کی نفاست و پاکیزگی، آپ کی عالی ظرفی، آپ کی کریم النّفسی اور آپ کی بے داغ سیرت ایسی نمایاں تھی کہ جن لوگوں کو بھی آپ سے سابقہ پیش آتا تھا وہ آپ کی تکریم و عزت کیے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ یہ رعب اُس وقت بھی کارفرما رہا جب اسلام کی دعوت پیش کرنے کی وجہ سے قریش کے لوگ آپ کی جان کے دشمن ہو گئے تھے۔ دشمنی کے جوش میں پاگل ہو کر بسا اوقات وہ آپ کے ساتھ بڑی بڑی بیہودگیاں کر بیٹھتے تھے، لیکن جس درجے کی دشمنی اُن کے سینوں میں آگ کی طرح بھڑک رہی تھی، اور جس دشمنی کی بنا پر وہ اپنے بیٹوں اور بھائیوں اور قریب ترین خونی رشتہ داروں تک کو اذیت ناک مظالم سے معاف نہیں کر رہے تھے، اس کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص رعب تھا جو آپ کے مقابلے میں آکر انہیں بے بس کر دیتا تھا۔ آپ نے دعوتِ عام شروع کرنے کے بعد سخت سے سخت حالات میں بھی کھلم کھلا اپنی تبلیغ جاری رکھی۔ شعب ابی طالب میں محصور ہو جانے کے باوجود آپ برابر اُس حصار سے نکل کر دعوت کا کام انجام دیتے رہے۔ مکہ کے آخری تین سال، جو انتہائی سخت تھے، ان میں بھی آپ صرف مکّے میں آنے والوں ہی سے نہیں، عکاظ اور مجنّہ اور ذی المجاز اور مِنیٰ کے اجتماعات میں قبائل اور ان کے سرداروں سے بھی علانیہ ملاقاتیں کر کے اسلام کی دعوت پیش کرتے رہے۔ لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ آپ کی شخصیت میں کوئی ایسی زبردست طاقت تھی جس کی وجہ سے کوئی آپ کو فرائضِ رسالت انجام دینے سے باز نہ رکھ سکا۔ پچھلے صفحات میں آپ کی نگاہ سے وہ مثالیں گزر چکی ہیں جو بتاتی ہیں کہ آپ کا بدترین دشمن، ابوجہل تک آپ سے کس درجہ مرعوب تھا۔

نبوت سے پہلے کی زندگی

اب دیکھیے کہ نبوت سے پہلے چالیس سال تک آپ کی جو زندگی مکّے میں گزری تھی اُس کے اثرات کیا تھے۔ یہ زندگی صرف بے داغ ہی نہ تھی، بلند ترین سیرت و کردار کا ایک نمونہ تھی۔ جس معاشرے میں آپ بچپن سے ادھیڑ عمر تک رہے بسے تھے، جس کے لوگوں کو ہر پہلو سے آپ کے ساتھ رشتہ داری، ہمسائیگی، میل جول، دوستی، لین دین، غرض طرح طرح کے معاملات میں شب و روز سابقہ پیش آتا رہا تھا، ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو آپ کی سچائی، آپ کی دیانت، آپ کی شرافت، آپ کی اخلاقی پاکیزگی، آپ کے

حسنِ سلوک، آپ کی رحمدلی اور آپ کی ہمدردی و فیّاضی کا معترف نہ ہو۔ آپ مجسّم خیر تھے، کسی کو آپ سے شر کا تجربہ تو درکنار، اس کا اندیشہ تک کبھی نہ ہوا تھا۔ آپ کے اوپر لوگوں کا اتنا اعتماد تھا کہ وہ آپ کو "امین" کہتے تھے، اور یہ اعتماد اس وقت بھی قائم رہا جب اسلام کی دعوت پیش کرنے کی وجہ سے لوگ آپ کے دشمن ہو گئے تھے۔ اس حالت میں بھی دوست دشمن، سب اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھواتے رہے، کسی کو آپ سے خیانت کا خطرہ نہ تھا، اور آپ نے قتل گاہ سے نکلتے وقت بھی ان کی رکھوائی ہوئی امانتیں واپس کرنے کا اہتمام فرما کر اپنا کامل و اکمل امین ہونا قطعی طور پر ثابت کر دیا۔ آپ کی صداقت اس معاشرے میں اس درجہ مسلّم تھی کہ جب آپ نے اسلام کی دعوت شروع کی اور قریش کے لوگوں نے اس کو پورے زور شور کے ساتھ جھٹلایا، اس وقت بھی مخالفین آپ کو جھوٹا کہنے کی ہمت نہ کر سکے، بلکہ اس دعوت ہی کو جھوٹ کہتے رہے جو آپ نے پیش فرمائی تھی۔ بدترین عداوت کے دور میں بھی کوئی آپ کی سیرت و کردار پر کسی ادنیٰ درجے میں بھی حرف زنی نہ کر سکا۔ آپ سے قریب ترین تعلق جن لوگوں کا تھا، جن سے کوئی عیب نہ چھپ سکتا تھا (اگر معاذ اللہ وہاں کوئی عیب ہوتا) وہی سب سے بڑھ کر آپ کے گرویدہ اور آپ کے فضائلِ اخلاق سے متاثر تھے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے شادی کے لیے قریش کے بڑے بڑے سرداروں کی درخواستیں ردّ کر دیں، اور خود خواہش کر کے آپ سے اسی بنا پر شادی کی کہ وہ آپ کی اخلاقی خوبیوں پر فدا ہو گئی تھیں۔ پندرہ برس کی ازدواجی زندگی اس بات کے لیے بالکل کافی ہوتی ہے کہ بیوی اپنے شوہر کے عیب و صواب سے خوب واقف ہو جائے، خصوصاً جب کہ وہ شوہر سے عمر میں بڑی بھی ہو، عاقل و فرزانہ بھی ہو، اور شوہر اسی کے مال سے کاروبارِ تجارت بھی کر رہا ہو۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے اس طویل اور انتہائی قریبی مشاہدے اور تجربے کا نتیجہ جو کچھ نکلا وہ یہ تھا کہ انھوں نے آپ کو محض ایک بلند پایہ انسان ہی نہیں، بلکہ اتنا عالی مرتبہ انسان پایا کہ انھیں آپ کو رسولِ رب العالمین مان لینے اور آپ پر ایمان لے آنے میں ایک لمحہ بھر بھی تامّل نہ ہوا۔ حالانکہ ایک بناوٹی آدمی کی دنیادار بیوی اس کے مکر اور اس مکر کے فوائد میں چاہے کتنا ہی حصہ لیتی رہے، وہ دل سے نہ کبھی اس کی معتقد ہو سکتی ہے اور نہ اس پر ایمان لا سکتی ہے۔

حضرت زید بن حارثہؓ کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غلامی کی حالت میں شروع ہوا

تھا۔ آقا اور غلام کے درمیان خوشگوار رابطہ بھی ایک نادر الوقوع چیز ہے کجا کہ غلام کو آقا سے محبت ہو، کیونکہ وہ بالکل بے بس ہوتا ہے اور آقا اس سے ہر طرح خدمت لینے کا حق دار ہوتا ہے، خواہ وہ خدمت اُس کے لیے کتنی ہی شاق اور اس کی طبیعت پر کتنی ہی گراں ہو۔ اس کے علاوہ غلام کو آقا کی زندگی کے اچھے اور بُرے سب پہلو دیکھنے کا موقع ملتا ہے، اور ایک بے اختیار خادم کی حیثیت سے اس کے سامنے اپنے مختارِ مطلق آقا کی زندگی کے بُرے پہلو زیادہ آتے ہیں۔ لیکن حضورؐ ایسے آقا تھے کہ غلام آپؐ کا گرویدہ ہوتا چلا گیا، حتٰی کہ جب اس کے باپ اور چچا اُسے غلامی سے چھڑانے کے لیے آئے تو اس نے آزاد ہو کر اپنے ماں باپ سے جا ملنے کی بہ نسبت حضورؐ کی غلامی میں رہنے کو ترجیح دی۔ ۱۵ سال آپؐ کی خدمت میں رہ کر یہ غلام، جسے آپؐ نے آزاد کر کے بیٹا بنا لیا تھا، آپؐ کے اخلاق کریمانہ سے اتنا متاثر ہوا کہ جب اُسے آپؐ کے منصبِ نبوت پر سرفراز ہونے کا علم ہوا تو اس نے بھی حضرت خدیجہؓ کی طرح آپؐ پر ایمان لانے میں ایک لمحہ بھر بھی توقّف نہ کیا۔ وہ کوئی ناسمجھ بچہ نہ تھا بلکہ ۳۰ برس کا جوان تھا اور ایسا ذکی و دانشمند تھا کہ ۸ھ میں وہ اس فوج کا کمانڈر بنا کر بھیجا گیا جس میں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور حضرت خالدؓ بن ولید جیسے لوگ اس کے ماتحت تھے۔ اس لیے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ کوئی کم عقل خادم تھا جسے نبوت و رسالت کی اہمیت معلوم نہ تھی اور محض اپنے مخدوم کی شخصیت سے مرعوب ہو کر وہ بے سمجھے بوجھے ایمان لے آیا تھا بلکہ درحقیقت اس نے اپنے پندرہ سال کے طویل تجربے میں آپؐ کو اتنا عالی مرتبہ انسان پایا تھا کہ اسے آپؐ کے رسولِ خدا ہونے میں ذرہ برابر شک لاحق نہ ہوا۔ حضورؐ کی اسی اخلاقی فضیلت کو چند سال پہلے وہ اپنے باپ کے ساتھ نہ جانے کی وجہ بتا چکا تھا۔

ایسا ہی معاملہ حضرت ابوبکرؓ کا تھا جو بیس سال سے آپؐ کے ہم نشین ہی نہیں بلکہ گہرے دوست تھے، حضرت علیؓ کا تھا جنھوں نے آپؐ کے گھر ہی میں پرورش پائی تھی، اور ورقہ بن نوفل کا تھا جو بچپن سے حضورؐ کی زندگی دیکھتے چلے آرہے تھے اور حضرت خدیجہؓ کے قریبی رشتہ دار ہونے کی وجہ سے جنھیں آپؐ کو اور زیادہ جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ پھر ابتدائی مسلمانوں کو دیکھیے: حضرت عثمانؓ آپؐ کی پھوپھی کے نواسے تھے۔ حضرت زبیرؓ آپؐ کے پھوپھی زاد بھائی اور حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے۔ حضرت ابوسلمہؓ آپؐ کے دودھ شریک بھائی بھی تھے اور پھوپھی زاد بھائی بھی۔ حضرت

جعفرؓ بن ابی طالب آپؐ کے سگے چچازاد بھائی تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص آپؐ کی والدۂ ماجدہ کے رشتہ دار تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو آپؐ کی سیرت و کردار کے ہر پہلو کو قریب سے نہ دیکھ چکا ہو، اور یہی لوگ آپؐ کی نبوت کو سب سے پہلے تسلیم کرنے والوں میں سے تھے۔

نبوت کے بعد آپؐ کے اوصافِ عالیہ کا ظہور کسی تحریک کا آغاز ہی اگر ایسی عظیم و جلیل ہستی کی رہنمائی میں ہو تو یہ بجائے خود بہت بڑا سرمایہ ہے۔ لیکن شروع ہونے کے وقت سے ۱۳ سال تک اس ابتدائی سرمایہ میں جو مزید اضافے ہوئے وہ اتنے قیمتی تھے کہ انسانی تاریخ ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ سب سے پہلے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن اوصاف کو دیکھیے جو اِس دَور میں نمایاں ہو کر سامنے آئے اور سب سے بڑھ کر اِس دعوت کو فروغ دینے کے موجب بنے۔

آپؐ کا مالی ایثار آپؐ کا اولین وصف وہ ایثار تھا جو آپؐ نے اس کارِ عظیم کے لیے کیا۔ آغازِ نبوت کے وقت آپؐ ایک نہایت کامیاب اور خوش حال تاجر تھے۔ ایک طرف حضرت خدیجہؓ کا مال تھا جو قریش کے دوسرے تاجروں کے مجموعی مال سے کم نہ تھا۔ دوسری طرف آپؐ کی ذہانت و فراست، حُسنِ تدبیر اور راستبازی کی ساکھ تھی، جس کا مقابلہ کوئی دوسرا نہ کرسکتا تھا۔ یہ دونوں چیزیں جس کاروبار میں یکجا جمع ہوگئی ہوں، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کیسی زبردست ترقی کر رہا ہوگا۔ لیکن نبوت سے پہلے اس مال کو حضورؐ اور آپؐ کی شریکِ حیات نے محض اپنے عیش و آرام کے لیے مخصوص نہیں کر رکھا تھا، بلکہ نہایت دریا دلی کے ساتھ آپؐ اسے رشتہ داروں سے صلہ رحمی، حاجت مندوں کی مدد، بے کسوں کی دست گیری اور مسافروں کی مہمان نوازی پر خرچ کرتے رہے تھے اور ہر کارِ خیر میں آپؐ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس لیے آغازِ نبوت میں کوئی بہت بڑا اندوختہ آپؐ کے پاس نہ تھا۔ پھر جب فرائضِ نبوت کا بار آپؐ پر ڈالا گیا تو رفتہ رفتہ آپؐ نے اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لگا دیا، اور آپؐ کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ تبلیغِ دین کے ساتھ اپنی تجارت بھی چلا سکیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جب آپؐ طائف تشریف لے گئے تو آپؐ کو پیدل ہی جانا پڑا۔ کوئی سواری آپؐ کو میسر نہ تھی۔ ہجرت کی تو اس کے سارے مصارف حضرت ابوبکرؓ نے برداشت کیے، حتیٰ کہ اہل و عیال کو مدینے بلانے کے لیے بھی آپؐ کو ۵۰۰ درہم جنابِ صدیقؓ سے لینے پڑے۔ آپؐ کا دستِ مبارک درہم و دینار سے بالکل خالی تھا۔ ظاہر ہے کہ

جب ایک دعوت کا پیش کرنے والا خود اُس دعوت کے کام پر اپنے ذاتی مفاد کو اس طرح قربان کر رہا ہو، تو ہر دیکھنے والا اس بات کا قائل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں بالکل مخلص اور بے غرض ہے حتیٰ کہ دشمن اور مخالف تک زبانوں سے خواہ کچھ ہی کہتے رہیں، اپنے دلوں میں یہ مان جاتے ہیں کہ اِس دعوت کے سامنے اُس کا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں ہے۔ اور جو لوگ اس کی دعوت کو قبول کر کے اس کے ساتھ آتے ہیں ان کے لیے ان کے رہنما کی مثال ایسی سبق آموز ہوتی ہے کہ وہ بھی حق کو محض حق ہونے کی بنا پر مانتے ہیں، کسی ذاتی غرض کا لوث ان کے ایمان کے ساتھ لگا ہوا نہیں ہوتا، اور ایثار و قربانی میں بھی وہ اپنے ہادی و رہبر کی پیروی کرتے ہیں۔

آپؐ کا زبردست عزم

دوسری چیز آپ کے عزم کی پختگی تھی جسے مشکلات و مصائب اور مخالفتوں کا کوئی بڑے سے بڑا طوفان بھی شکست نہ دے سکا، جسے نہ کوئی خوف اپنی جگہ سے ہٹا سکا، نہ کوئی لالچ پھسلا کر راہِ حق سے منحرف کر سکا، اور نہ کسی قسم کے سخت سے سخت حالات مایوسی و دل شکستگی میں تبدیل کر سکے۔ وہ آپ کی پہاڑ جیسی استقامت ہی تھی جس سے ٹکرا کر ساری مخالف طاقتیں آخر کار اِس بات سے مایوس ہو گئیں کہ اپنے کسی حربے، کسی مظاہرۂ قوت، کسی ظلم و ستم، کسی تحریص و ترغیب، کسی افترا پردازی اور الزام تراشی کی مہم اور کسی بڑے سے بڑے ہتھکنڈے سے وہ آپؐ کو اُس کام سے باز رکھ سکیں گے جسے لے کر آپ اٹھے ہیں۔ دیکھنے والے آپ کی اس اولوالعزمی کو سالہا سال تک بالکل بے لچک پا کر یہ اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کہ جب تک کسی شخص کو اپنے حق پر ہونے کا کامل یقین نہ ہو، اور جب تک کوئی شخص ذاتی اغراض کی کھوٹ سے بالکل پاک نہ ہو، وہ اپنے عزم میں اتنا مضبوط نہیں ہو سکتا۔ اِسی چیز نے آپ کے ساتھیوں میں بھی ایمان کی مضبوطی اور راہِ حق میں استقامت پیدا کی، اور اسی نے تمام غیر جانب دار لوگوں کو بھی قائل کر دیا کہ آپؐ جو دعوت پیش کر رہے ہیں وہ خالص حق پرستی پر مبنی ہے۔

آپؐ کی بے نظیر شجاعت

تیسری چیز آپ کی بے خوفی اور شجاعت و بہادری تھی جو کسی بڑی سی بڑی طاقت سے دب جانا اور کسی بڑے سے بڑے خطرے سے ڈر جانا جانتی ہی نہ تھی۔ کفارِ قریش کا ایک بپھرا ہوا مجمع آپؐ کو حرم میں تنہا گھیر لیتا ہے اور آپؐ سے کہتا ہے کہ تم وہ ہو جو یہ کہتے ہو، اور تم وہ ہو جو یہ کہتے ہو۔ ان ساری باتوں کے جواب میں آپؐ بے جھجک فرماتے چلے جاتے ہیں کہ ہاں میں یہ کہتا ہوں اور میں یہ بھی کہتا ہوں۔ جان کے دشمن لوگوں میں اپنے آپ کو گھرا ہوا پا کر آپ پر ذرا سی گھبراہٹ تک طاری نہیں

ہوتی۔ غارِ ثور کے عین دھانے پر دشمن پہنچ جاتے ہیں، اور آپ پورے اطمینان کے ساتھ اس وقت نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ عرض کرتے ہیں کہ یہ ظالم اپنے قدموں کی طرف نگاہ ڈالیں تو ہمیں دیکھ لیں گے آپ بڑے ٹھنڈے دل سے، کسی ادنیٰ درجہ کی پریشان خاطری کے بغیر فرماتے ہیں کہ "ابوبکر تمہارا اُن دو آدمیوں کے متعلق کیا خیال ہے جن میں تیسرا اللہ ہو؟ گھبراؤ نہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" دشمنوں نے آپ کے سرِ مبارک کے لیے انعام مقرر کر رکھا ہے۔ ہر طرف انعام کے لالچ میں آپ کی تلاش کے لیے لوگ دوڑے پھر رہے ہیں۔ اور آپ اطمینان کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے سفر کرتے چلے جا رہے ہیں، کسی طرف مڑ کر بھی یہ نہیں دیکھتے کہ کہیں کوئی تعاقب میں تو نہیں چلا آ رہا ہے۔ ایسے بہادر رہنما کے ساتھ بہادر لوگ ہی آتے ہیں، اور اُس کی بہادری دیکھ دیکھ کر ان کی بہادری میں اور زیادہ اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ دشمن بھی، خواہ دشمنی میں کتنا ہی اندھا ہو چکا ہو، اُس کے اِس وصف کی قدر کیے بغیر نہیں رہتا۔ اس کی ہمت بیٹھ جاتی ہے جب اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سابقہ ایک ایسے شخص سے ہے جو ڈر نام کی کسی چیز کو جانتا ہی نہیں۔ کسی تحریک کے لیے، اور خصوصاً اسلامی تحریک کے لیے اس کے رہنما کا نڈر اور بے خوف اور شجاع ہونا ایک بڑا اہم وصف ہے۔ رہنما کی بزدلی، بلکہ اس کی شجاعت میں ذرا سی کمزوری بھی آزمائش کے مواقع پر پوری تحریک کو لے بیٹھتی ہے۔

آپ کی عالی ظرفی چوتھا اہم ترین وصف آپ کا صبر و تحمل، ضبطِ نفس، اور بلند حوصلہ تھا۔ آپ مخالفین کی کسی رکیک سے رکیک حرکت پر بھی کبھی غصے میں آپے سے باہر نہ ہوئے۔ کسی گالی کا جواب آپ نے گالی سے نہ دیا۔ کسی بدزبانی اور کسی بیہودہ الزام کے جواب میں آپ کی زبانِ مبارک سے ایک لفظ بھی شائستگی سے گرا ہوا نہ نکلا۔ دشمنوں نے بارہا ایسی حرکتیں کیں جو سخت دل آزار، سخت توہین آمیز اور سخت اشتعال انگیز تھیں۔ مگر آپ بڑی عالی ظرفی کے ساتھ ہر بات کو پی گئے، اور ان کی بُرائی کا جواب بُرائی کے بجائے بھلائی ہی سے دیتے رہے۔ مکہ معظمہ کے طویل دَورِ مصائب میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس میں تہذیب و شرافت کا دامن آپ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہو۔ یہ وہ چیز تھی جو گرد و پیش کے معاشرے میں آپ کا اخلاقی وقار بڑھاتی چلی گئی اور آپ کے مخالفوں کو ہر اُس شخص کی نظر سے گراتی چلی گئی جس کے اندر ذرہ برابر بھی اخلاق و شرافت کا کوئی جوہر موجود تھا۔ طائف سے زیادہ سخت وقت آپ پر کبھی نہ گزرا تھا۔ مگر اُس وقت بھی آپ کے دل اور زبان سے دُعا ہی نکلی اور آپ اِس پر راضی نہ ہوئے کہ اس ظلم کے بدلے میں ظالموں پر خدا

کا عذاب نازل ہو۔ میدانِ جنگ سے پہلے ہی اخلاق کے میدان میں آپ اپنے مخالفوں کو شکست دے چکے تھے، اور اِس شکست پر آخری مہر اُس وقت لگ گئی جب قتل گاہ سے نکلتے وقت بھی آپ نے اہلِ مکہ کی امانتیں اُن کو واپس دینے کی فکر فرمائی۔ کوئی بالکل ہی مُردہ ضمیر ہوگا جو اِس کردار کو دیکھ کر اپنے دل میں مان نہ گیا ہو کہ جاہلیت کے حامی اُس شخص سے لڑ رہے ہیں جو اُن کی قوم ہی کا نہیں، ساری دُنیا کا شریف ترین انسان ہے۔ اسلامی تحریک میں شامل ہونے والوں کی اخلاقی تربیت کے لیے بھی ہزار وعظوں سے بڑھ کر اپنے ہادی و رہبر کی یہ عملی مثال مؤثّر تھی۔ اسی کا اثر تھا کہ جس نے بھی آپ کی پیروی اختیار کی وہ اخلاق کے اعتبار سے اپنے معاشرے میں اتنا بلند ہوگیا کہ ہر دیکھنے والا عَلانیہ بُت پرست اور خدا پرست کے فرق کو دیکھ سکتا تھا۔

قول اور عمل میں کامل مطابقت

پانچواں اور سب سے زیادہ اہم وصف یہ تھا کہ آپ کے قول اور عمل میں برائے نام بھی کوئی تضاد نہ تھا۔ جو کچھ آپ کہتے تھے وہی کرتے بھی تھے۔ جن چیزوں کو آپ نے بُرا کہا اور لوگوں کو ان سے منع کیا، اُن کا ادنیٰ شائبہ تک آپؐ کی سیرت و کردار میں نہ پایا جاتا تھا۔ مکّے کے لوگ آپ کی گھر سے باہر کی زندگی ہی کو نہیں، گھر کے اندر کی زندگی کو بھی دیکھ سکتے تھے، کیونکہ ان میں کتنے ہی لوگ آپؐ کے والد ماجد، یا آپ کی والدۂ ماجدہ، یا آپ کی اہلیۂ محترمہ کے رشتہ دار تھے۔ لیکن کوئی یہ نہ کہہ سکا کہ آپؐ دوسروں کو جن بُرائیوں سے روکتے ہیں وہ، یا ان میں سے کوئی ایک کم سے کم درجے کی بُرائی بھی آپ کی اپنی زندگی میں پائی جاتی ہے۔ اسی طرح جن نیکیوں اور بھلائیوں کی طرف آپ لوگوں کو دعوت دیتے تھے، سب سے بڑھ کر آپ خود اُن پر عمل پیرا تھے۔ آپ کی زندگی اُن کا مجسّم عملی نمونہ تھی۔ کوئی اِس امر کی کبھی نشاندہی نہ کر سکا کہ آپ سے اُن بھلائیوں پر عمل کرنے میں کوئی ادنیٰ درجے کی بھی کوتاہی ظاہر ہوئی ہے۔ کسی تحریک کی کامیابی کے لیے عموماً، اور اسلامی تحریک کے لیے تو خصوصاً یہ بہترین ضمانت ہے کہ اُس کا رہنما قول و عمل کے تضاد سے بالکل پاک ہو، اور اس کی تعلیم محض زبانی جمع خرچ نہ ہو بلکہ اُس کی اپنی عملی زندگی اُس تعلیم کی جیتی جاگتی تصویر ہو۔ اِس کا گہرا اثر لازماً ان لوگوں پر بھی پڑتا ہے جو ایسے رہنما کی پیروی اختیار کرتے ہیں، اور وہ لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جو غیر متعصب نگاہ سے جستجوئے حق کی خاطر اُسے دیکھتے ہیں، حتّٰی کہ متعصب مخالفین میں سے بھی ایک بڑی تعداد بالآخر اس سے مسخّر ہوکر رہتی ہے۔

آپ کا تمام تعصبات سے پاک ہونا چھٹا وصف، جو اپنی اہمیت میں کسی دوسرے وصف سے کم نہیں، یہ تھا کہ آپ ہر تعصب سے پاک تھے۔ قبیلے، قوم، وطن، زبان، رنگ، نسل، غرض کسی چیز کا تعصب بھی آپ کے اندر نہ تھا۔ نہ آپ امیری و غریبی کے لحاظ سے انسان اور انسان کے درمیان فرق کرتے تھے، اور نہ معاشرتی مرتبے کی اونچ نیچ آپ کے لیے کوئی معنی رکھتی تھی۔ آپ انسان کو صرف انسان ہونے کی حیثیت سے دیکھتے تھے، اور انسانوں میں سے جو بھی حق کو قبول کر لیتا اُسے آپ کی جماعت میں بالکل برابر کا درجہ حاصل ہو جاتا تھا، خواہ وہ قریشی ہو یا غیر قریشی، خواہ وہ عرب ہو یا حبشی یا رومی، خواہ وہ کالا ہو یا گورا، خواہ وہ غریب ہو یا امیر، خواہ وہ جاہلیت کے معاشرتی نظام کی رو سے "شریف" ہو یا "کمین"۔ یہی وہ چیز تھی جس نے اسلامی تحریک کے یومِ آغاز ہی سے اُس کے ایک عالمگیر تحریک ہونے کی بنا ڈال دی تھی، امتِ مسلمہ کو ایک بین الاقوامی امت کی حیثیت بخش دی تھی، اسلام قبول کرنے والوں کے اندر سے اسلام و کفر کے سوا ہر دوسری بنیاد پر انسان اور انسان کے درمیان امتیاز کا احساس مٹا دیا تھا اور ان کی جماعت میں غلام اور آزاد، غریب اور امیر، برتر اور کمتر، عرب اور غیر عرب، سب بالکل مساوی حیثیت سے شریک تھے، اور شریک ہو سکتے تھے جبکہ وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے ہوں۔ عرب کے قلیل التعداد متکبروں کو چھوڑ کر باقی عام آبادی کے لیے یہ چیز اپنے اندر ایک فطری کشش رکھتی تھی جو بالآخر کارگر ثابت ہو کر رہی۔

یہ تھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اوصاف جو ۱۳ برس کے مکی دور میں ظاہر ہوئے اور جن کی زبردست قوتِ تاثیر سے دشمنوں کی ساری کوششوں کے علی الرغم اسلامی تحریک آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ مزید اوصافِ عالیہ ابھی آپ کے اندر مخفی تھے اور اپنے ظہور کے لیے دوسرے حالات کے متقاضی تھے جو آگے چل کر اسلامی تحریک کو مدینے میں میسر آئے۔

قرآن کی قوتِ تسخیر اس تحریک کا دوسرا عظیم ترین سرمایہ قرآن مجید تھا جس کا دو تہائی سے کچھ کم حصہ مکہ معظمہ میں نازل ہوا۔ عرب کے لوگ فصاحت و بلاغت اور زورِ بیان کے عاشق تھے۔ یہی عشق انہیں عکاظ جیسے میلوں میں شعراء اور فصحاء کا کلام سننے کے لیے کھینچ لے جاتا تھا۔ مگر قرآن سن کر اُن کی نگاہ میں بڑے سے بڑے زبان آوروں کی کوئی وقعت باقی نہ رہی۔ شاعر و خطیب اس کے آگے گُنگ ہو گئے۔ ادب کے لحاظ سے اس کی زبان اتنی بلند تھی کہ کوئی اُس سے بلند تر تو درکنار، اس کے برابر بھی اُونچے ادب کا تصور نہ کر سکتا تھا۔ اس کا بیان ایسا وجد آور تھا کہ لوگ اس کو سُن کر سر دُھننے لگتے تھے، مخالفین اُسے

سحر (جادو) کہتے تھے، اور غیر متعصب لوگ پکار اٹھتے تھے کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہو سکتا۔ اُس کی شدت تاثیر کا حال یہ تھا کہ حضرت عمر جیسے سخت دشمنِ اسلام کا دل اُس نے پگھلا دیا اور اُنہیں رسولِ اکرم کے قدموں میں لا ڈالا۔ قریش کے ایک نامور سردار جبیر بن مُطعِم جنگِ بدر کے بعد اسیروں کی رہائی پر بات چیت کرنے کے لیے مدینے گئے۔ وہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز پڑھا رہے تھے اور اس میں سورۂ طُور زیرِ تلاوت تھی بخاری و مسلم میں اُن کا اپنا قول منقول ہوا ہے کہ آیات ۳۵ تا ۴۹ جب حضور پڑھ رہے تھے تو میرا دل سینے سے اُڑا جاتا تھا۔ بعد میں ان کے مسلمان ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس روز یہ آیات سُن کر اسلام اُن کے دل میں جڑ پکڑ چکا تھا۔ اسی لیے دشمن کوشش کرتے تھے کہ لوگ اسے نہ سُنیں، مگر خود اُن سے رہا نہ جاتا تھا اور چھُپ چھُپ کر اُسے سنتے تھے۔ اِس انتہائی مؤثر کلام کے ذریعے سے شرک اور جاہلیت کے ایک ایک پہلو پر ایسی مدلّل تنقید کی گئی کہ کسی معقول آدمی کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ اُن عقائد اور رسوم اور اخلاقی بُرائیوں کے حق میں ایک لفظ بھی کہہ سکتا جن پر قریش اور عرب کے مذہب اور تمدّن کی بنا قائم تھی۔ پھر اسی کلام کے ذریعہ سے کمال درجہ دل نشین پیرائے میں اسلام کے عقائد، اس کے اصولِ تہذیب و تمدّن اور اس کی اخلاقی تعلیمات کو پیش کیا گیا جن کی تردید میں کسی بڑے سے بڑے مخالف کے لیے بھی زبان کھولنے کی گنجائش باقی نہ رہی۔ اس کے بعد کفّار مجبور ہو گئے کہ اسلام کو زک دینے کے لیے مار پیٹ، ظلم و ستم، گالی گلوچ، کذب و افترا اور شور و شغب کے ہتھیاروں سے کام لیں۔ مگر یہ بجائے خود ان کی طرف سے دلیل و حجت اور اخلاق و شرافت کے میدان میں اپنی شکست کا عملی اعتراف تھا۔ ہر وہ شخص جس میں ذرا بھی معقولیت کا شائبہ پایا جاتا تھا، اِس معرکے کے دونوں فریقوں کو دیکھ کر یہ محسوس کرتا چلا گیا کہ منکرین و مخالفین کے پاس قرآن کے دلائل اور اس کی پاکیزہ تعلیم کا کوئی جواب اوچھے ہتھکنڈوں اور انسانیت سے گری ہوئی چالوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ کھلا معرکہ صرف مکّے ہی میں لوگوں کے سامنے برپا نہ تھا، بلکہ تمام عرب کی نگاہیں بھی اس کو دیکھ رہی تھیں۔ مکّے میں تو خیر شب و روز ہی عوام و خواص سب کسی نہ کسی طرح قرآن بھی سُن رہے تھے اور اُن کارروائیوں کو بھی دیکھ رہے تھے جو سردارانِ قریش اور ان کے زیرِ اثر اوباش لوگ قرآن کے جواب میں کر رہے تھے۔ لیکن دس برس تک ہر سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عکاظ سے منیٰ تک کے اجتماعات میں تشریف لے جا کر عرب کے ہر حصّے سے آئے ہوئے لوگوں کو قرآن سُناتے رہے، اور ابوجہل اور ابولہب جیسے لوگ برسرِ عام آپ کو پتھر مار کر، اور آپ پر خاک دھول اُڑا کر اُن کو یہ بتاتے رہے کہ اس کلام کا جواب

ان کے پاس کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکّے میں بھی ساری رکاوٹوں کے باوجود اسلام پھیلتا چلا گیا، اور سرزمین عرب میں بھی کوئی قبیلہ ایسا نہ رہا جس میں کچھ نہ کچھ لوگ اسلام سے متاثر نہ ہو گئے ہوں۔ مکّی دَور میں صورتِ حال یہ تھی کہ علانیہ اسلام قبول کر لینے والے لوگ تو کم تھے، مگر اُن سے بیسیوں گنے زیادہ ایسے اشخاص معاشرے میں موجود تھے جن کے دلوں میں قرآن کی تعلیم، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و تکریم، اور آپ کے مظلوم ساتھیوں کے لیے ہمدردی، اور قریش کے سراسر بے جا ظلم و ستم کے لیے نفرت جاگزیں نہ ہو گئی ہو۔ اس دَور کا یہ کام بھی پوری طرح بارآور ہونے کے لیے ایک مدینے کا طالب تھا جو ٹھیک اپنے وقت پر اس کے لیے آغوش کھول کر سامنے آگیا۔

حضورؐ پر ایمان لانے والوں کے اوصاف

تیسرا بڑا سرمایہ ایمان لانے والے مسلمانوں کا وہ چیدہ گروہ تھا جو اس تحریک کو ۱۳ سال کے دوران میں میسر آیا۔ یہ وہ صاف دماغ اور سُلجھے ہوئے ذہن کے لوگ تھے جنہوں نے شرک و جاہلیت کے اس تاریک ماحول میں پرورش پانے کے باوجود قرآن مجید کی تعلیمات سُن کر اپنے دینِ آبائی کا غلط اور دینِ اسلام کا برحق ہونا تسلیم کر لیا اور کوئی تعصب انہیں ایمان لانے سے نہ روک سکا۔ اُن کو معلوم تھا کہ اپنے خاندان، اپنے قبیلے اور اپنے شہر کے عام لوگوں کی رائے کے خلاف اسلام قبول کرنے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کرنے کے کیا معنی ہیں۔ ایمان لانے والوں پر جو عذاب توڑے جا رہے تھے وہ سب ان کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ مگر وہ اس دل گردے کے لوگ تھے کہ کوئی خوف انہیں باطل کو رد اور حق کو قبول کرنے سے نہ روک سکا۔ انہوں نے ہر طرح کے ظلم صرف اس لیے سہے کہ جس چیز کو وہ باطل سمجھ چکے تھے اس کی پیروی کرنا انہیں کسی حال میں گوارا نہ تھا، اور جس چیز کا حق ہونا انہیں معلوم ہو چکا تھا اُسے چھوڑنے کے لیے وہ تیار نہ تھے۔ انہیں بُری طرح مارا پیٹا گیا۔ انہیں اُلٹا لٹکایا گیا۔ انہیں بھوک پیاس کی مار دی گئی۔ انہیں باندھ کر قیدِ تنہائی میں ڈال دیا گیا۔ اُن کو آگ کے انگاروں پر لٹایا گیا۔ انہیں تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ ان کے تجارت پیشہ یا صنعت پیشہ لوگوں کا کاروبار بٹھا دیا گیا۔ اُن کے بڑے بڑے باعزت لوگوں کو برسرِعام ذلیل کیا گیا۔ مگر یہ سب کچھ انہوں نے محض حق کی خاطر برداشت کر لیا اور ان میں سے کسی ایک مرد یا عورت کو بھی ایمان سے کفر کی طرف نہ پھیرا جا سکا۔ انہوں نے اپنا ایمان بچانے کے لیے دو دفعہ حبش کی طرف اور آخر میں مدینے کی طرف ہجرت کی، گھربار، مال اسباب، عزیز رشتہ دار، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خدا کی راہ میں نکل کھڑے ہوئے۔ ان میں سے بکثرت ایسے تھے جو تن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہ لے جا سکے۔ اُن کے اس طرزِ عمل نے

ثابت کر دیا کہ اسلامی تحریک کو وہ انتہائی مخلص و جاں نثار فدائی مل گئے ہیں، جو اگرچہ مٹھی بھر ہیں، مگر ایسے بہادر ہیں کہ اپنے دین کے لیے ہر قربانی دے سکتے ہیں، ہر مصیبت جھیل سکتے ہیں، ہر تکلیف و اذیت برداشت کر سکتے ہیں، اور ہر بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرا سکتے ہیں۔ اِن خوبیوں کے ساتھ ایسا عظیم اخلاقی انقلاب قرآنِ کریم کی تعلیم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے ان کی زندگی میں رونما ہو گیا کہ اپنی راستبازی و دیانت، اپنی پرہیزگاری و طہارت، اپنی خدا ترسی و خدا پرستی، اپنی عفّت و پاکدامنی، اپنی شرافت و شائستگی اور اپنی مضبوط اور قابلِ اعتماد سیرت کے اعتبار سے صرف عرب ہی میں نہیں، دنیا بھر میں ان کا جواب نہ پایا جاتا تھا۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس معاشرے میں ایک منارۂ نور کی طرح نمایاں تھے، اسی طرح آپ کے ساتھیوں کی زندگی کا اخلاقی انقلاب بھی اس قدر ظاہر و باہر تھا کہ ہر دیکھنے والی آنکھ کفار کی اور اُن کی اخلاقی حالت کا فرق علانیہ دیکھ سکتی تھی۔ تعصب اور عناد کی بنیاد پر مخالفین زبان سے اس کا انکار کر سکتے تھے، مگر ان کے دل جانتے تھے کہ قدیم جاہلیت کیا سیرت و کردار پیدا کرتی تھی، اور یہ نیا دین کس سیرت و کردار کے انسان تیار کر رہا ہے۔

انصارِ مدینہ کے اوصاف

چوتھا عظیم اور بیش قیمت سرمایہ جو مکّی دَور کے آخری تین سالوں میں اسلامی تحریک کو ملا وہ مدینے کے انصار کا خلوصِ ایمانی تھا۔ ان لوگوں کو نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و تربیت میسّر آئی تھی، نہ آپ کی اور آپ کے صحابہ کی پاکیزہ زندگیوں کو دیکھنے کا موقع ملا تھا، نہ قرآن پاک کا اُتنا علم حاصل ہوا تھا جو مکّے کے اہلِ ایمان کو حاصل تھا، لیکن یہ ایسے سلیم الطبع اور صحیح الدّماغ لوگ تھے جو حق کی ایک جھلک دیکھتے ہی اس پر فدا ہو گئے۔ صدیوں کی رچی بسی مشرکانہ جاہلیت کو انہوں نے اسلام کی صراطِ مستقیم کا نشان پاتے ہی اپنے دل و دماغ سے گرد کی طرح جھٹک کر نکال پھینکا۔ وہ پکّے پھلوں کی طرح اسلام کی جھولی میں یوں جھڑتے چلے گئے کہ ۱۳ سال کے اندر مکّے میں جتنے لوگ ایمان لائے تھے، تین سال میں ان سے بہت زیادہ مردوں اور عورتوں اور جوانوں اور بوڑھوں نے مدینے میں ایمان قبول کر لیا۔ انہوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ وہ ایسے خلوص کے ساتھ ایمان لائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپؐ کے ساتھی تمام اہلِ ایمان کو انہوں نے اپنے ہاں ہجرت کر آنے کی دعوت دے دی، حالانکہ یہ دعوت دیتے وقت وہ خوب جانتے تھے کہ اس کے نتیجے میں انہیں تمام عرب کی دشمنی مول لینی ہو گی، جیسا کہ آخری بیعتِ عقبہ کے موقع پر اُن کی تقریروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ انہوں نے حضورؐ

اور آپ کے مکی صحابہ کے لیے اپنے شہر کو دار الہجرت کے طور پر پیش کر دیا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے پوری خوش دلی اور رضا مندی سے آپ کو اپنا حاکم و فرماں روا تسلیم کیا، آپ کی وفادار رعیت اور جاں نثار فوج بن گئے، آپ کے ساتھ ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کو اپنے شہر میں اپنے ساتھ برابر کے حقوق دیے اور اپنے گھر، اپنے مال اور اپنی جائدادوں تک کو ان کے لیے پیش کر دیا۔

اسی چیز نے تاریخ کا رُخ بدل ڈالا۔ اسلام کو ایک دعوت اور تحریک کے مقام سے اُٹھا کر ایک معاشرے اور ریاست کی حیثیت دے دی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ موقع بہم پہنچا دیا کہ آپ ایک آزاد و خود مختار دارالاسلام میں اسلام کے ایک ایک پہلو کو عملی جامہ پہنا کر ساری دنیا کے سامنے یہ نمونہ پیش کر دیں کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کا بھیجا ہوا یہ دین کیسے افراد تیار کرتا ہے، کیسا معاشرہ بناتا ہے، کس قسم کی تہذیب اور کس طرح کا تمدن پیدا کرتا ہے، کیسی اخلاقی روح پورے معاشرے میں جاری و ساری کر دیتا ہے، معیشت، معاشرت، تعلیم، سیاست، قانون اور عدالت کا کیسا نظام قائم کرتا ہے، جنگ میں اس کی تہذیب کیا ہے، صلح پا کر وہ مفتوحین کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے، معاہدے کر کے وہ ان کی کیسی پابندی کرتا ہے، اور بین الاقوامی تعلقات میں اس کا رَوّیہ کیا ہے۔ اس نمونے کے خدوخال کیا تھے، اور اس کو عملاً پیش کرنے سے کیا نتائج برآمد ہوئے، یہ ہماری تیسری جلد کا موضوع بحث ہے۔

یہاں پہنچ کر مکی دَور کا بیان ختم ہو گیا ہے۔ آگے مدنی دَور کے لیے مجھے بہت زیادہ تیاری کرنی پڑ رہی ہے ابھی اسے لکھنا شروع نہیں کر سکا ہوں۔ اس لیے کچھ مدت تک ان صفحات میں سیرت سرورِ عالم کی اشاعت کا سلسلہ بند رہے گا۔ دُعا کرتا ہوں، اور قارئین ترجمان القرآن سے بھی دعا کی درخواست کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس کام کو مکمل کرنے کی توفیق اور قوت عطا فرمائے اور اپنی ہدایت و رہنمائی سے نوازے۔

ابوالاعلیٰ